

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

نَقْشِ آغَا

اسلام میں قرآن کریم کے بعد دوسرا مقام سنت اور حدیث نبویؐ کا ہے۔ قرآن کریم اول تا آخرہ سنت نبویؐ کی اس اہم ترین مرکزی اور بنیادی حیثیت پر زور دیتا ہے۔ وہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو ایک ایسے رسول کی حیثیت سے ہمارے سامنے پیش کرتا ہے، جو بیک وقت معلم اور مربی بھی ہیں، شارح کتاب اللہ بھی اور تمام امت کے بڑے پشیرا اور نمونہ تقلید بھی۔ وہ رسول کی اتباع اور اطاعت کو محبت خداوندی اور یوم آخرت کی امید واری کی علامت قرار دیتا ہے، اور حضورؐ کی زندگی اور آپ کے اقوال و افعال کو اپنا اسوہ حسنہ بنانے والوں کو کافریں کے زمرہ میں شمار کرتا ہے۔ اسکی بیشمار آیتیں ناطق ہیں۔ کہ رسول کا کام صرف کتاب پہنچانا نہیں بلکہ اسکی تشریح و تعبیر اور اسکی تفسیر و تبیین بھی آپ کے فریضہ نبوت میں شامل اور منصب رسالت کا تقاضا ہے۔ وہ جگہ جگہ رسول کو بحیثیت شارح پیش کر کے انہیں تشریحی اختیارات (LEGISLATIVE POWERS) دیتا ہے اور کبھی مختلف پیرالوں میں تصریح کرتا ہے کہ رسول کریم اللہ کے مقرر کئے ہوئے حاکم، فرمانروا اور قاضی (نج) ہیں۔ وہ خدائے بزرگ و برتر کی قسم کھا کر اعلان کرتا ہے کہ تیرے رب کی قسم جب تک یہ لوگ دل و جان سے تیرے فیصلوں کے سامنے سر تسلیم خم نہ کر دیں یہ ہرگز ہرگز مؤمن نہیں ہو سکتے۔ تیری مرضی اور فیصلہ سے انکار تو کیا، اگر انہیں اپنے دلوں میں ذرا سی تنگی بھی محسوس ہو جائے تو یہ پیر متاع ایمان کے ضیاع اور دین و اسلام کی بربادی کا سبب ہوگی۔ مومنین کا شیوہ تو یہ ہے کہ جب اللہ اور رسول کی کسی بات اور فیصلہ کی طرف بلائے جائیں تو وہ دوڑتے چلے آئیں۔ اور کہیں کہ ہم نے سن لیا اور ہم نے مان لیا۔ (النور - ۵۱) رہے کفار اور منافقین، تو ان کا حال یہ ہے کہ ایسے موقع پر رسول سے کئی کتراتے ہیں۔ (النساء - ۶) وہی قرآن سبکی آڑ لیکر آج دین اور ملت اسلامیہ پر شبخون کر نیوالے یلغار کر رہے ہیں، اسی کتاب مبین کا اعلان ہے کہ رسول کی اطاعت خدا کی اطاعت اور اس کے تشریحی منصب سے انکار خدا اور اسکی کتاب سے انکار ہے۔ وہی کتاب کہتی ہے کہ رسول کی زبان خدا کی زبان۔ اس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ اس کا قول خدا کی وحی اس کا عمل خدا کا فیصلہ اور اس کا فیصلہ خدائے بزرگ و برتر کا اہل قانون ہوتا ہے۔

پھر آہ! ان لوگوں کی نفسانی خباثتوں اور فطری کج فہمیوں کا ماتم کن الفاظ سے کیا جاسکے جو

قرآن کا نام لیکر رسولِ اولین و آخرین سے یہ سارے مناصب (حاکم بدین) پھین لینا چاہتے ہیں کہ جو کچھ ہے کتاب اللہ میں ہے، رسول کی اپنی حیثیت کچھ بھی نہیں، نہ اس کے ارشادات اور تشریحات قرآن کو شرعیات کا حصہ قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ انہیں مسلمانوں کے قانون کا ماخذ سمجھا جاسکتا ہے۔ حالانکہ سنت کا دوسرا ماخذ قانون (SOURCE OF LAW) ہونے پر صحابہ کرام سے لیکر آج تک امت مسلمہ کا اجماع چلا آ رہا ہے۔ مگر اسلام میں سنت کو جتنا اہم کردار اور اساسی حیثیت دی گئی ہے، اسلام اور رسولِ اسلام کی ذاتِ اقدس سے عناد رکھنے والے منافقین اور محدین نے سنت کی شرعی حیثیت گھٹانے میں اتنا ہی زور لگایا ہے کہ جب رسول کی تشریح اور تفسیر کو قرآنِ کریم کے احکام اور اصطلاحات سے الگ کر دیا جائے گا، تو اسلام اور قرآن کی من مانی تاویل بلکہ تحریف کے لئے راستہ کھل جائے گا۔ قرامطہ، باطنیہ، معتزلہ، خوارج اور اسطرح کے بیشمار فرق باطلہ میں یہ چیز آپ کو قدر مشترک کے طور پر ملے گی، خواہ یہ لوگ دعویٰ حدیث پر عمل کرنے کا کرتفہ رہے یا علانیہ انکار۔

پچھلی دو صدیوں سے یورپ کے مستشرقین اور مسلمانوں کے تجدّد زدہ طبقوں کے مساعی کا محور بھی زیادہ تر ”سنت رسول“ ہی رہا کبھی کھلے الفاظ میں اسے نشانہ تحقیق بنایا گیا اور کبھی منافقانہ لبادہ اوڑھ کر سنت کی نئی نئی تعبیرات کرنے کی شکل میں ہمارے ہاں کے تجدّد زدہ حضرات جو نہ تو اپنی علمی و فکری قوتوں کو خدا و رسول کی مرضیات پر چھوڑ دینا چاہتے ہیں اور نہ مجبوری اور مصلحتوں کی وجہ سے واضح طور پر اسلام اور ایمان سے انکار کر سکتے ہیں۔ ان کے مساعی کا نعلی بھی زیادہ تر سنت رسول کی شرعی حیثیت کو نقصان پہنچانے سے ہے۔ ایسے لوگ جن کی ساری علمی تنازع اپنے پیشرو غیر مسلم مغربی اساتذہ کی تحقیق و ریسرچ ہے، ہمیشہ سنت نبوی کے مصداق پھر اسکی اہمیت اور استنادی حیثیت کو مجروح اور مشکوک کرنے کے درپے رہتے ہیں۔ ان لوگوں میں سے غلام احمد پرویز اور اسکی جماعت تو کھلے بندوں احمدیث رسول سے انکار کی دعوت دیتی ہے۔ اور کچھ لوگ علانیہ انکار کئے بغیر سنت اور حدیث کو اپنی ملحدانہ اغراض کی بنیاد پر ایسے معافی پہنانا چاہتے ہیں جس سے سنت کی حقیقت تو مسخ ہو کر رہ جائے، مگر انکار حدیث کے الزام سے بھی ان کا دامن بچ جائے۔ اس طرز تحقیق کا سہرا رموائے عالم یہودی مستشرق پروفیسر جوزف شاخت کے سر پر ہے۔ اور ہمارے ہاں اس نظریہ کے فروغ و اشاعت کا فریضہ ان کے ونا شعار شاگرد ڈاکٹر فضل الرحمان اور ان کی ہمنوا جماعت بجالا رہی ہے۔ پہلی جماعت اپنی ناسد اغراض اور خواہشات

کی راہ میں سنت رسول کو سنگ گراں سمجھ کر اسے راستہ ہی سے ہٹا دینا چاہتی ہے۔ مگر ڈاکٹر فضل الرحمن کا نظریہ ”سنت جاریہ وغیرہ جاریہ“ وہ عیارانہ حربہ ہے جسے ہاتھ میں لیکر آپ ہر قسم کی دہدی اور عیاری پر تقویٰ اور پارسائی کا غلاف چڑھا سکیں گے۔ اس نظریہ کا خلاصہ فضل الرحمن صاحب کے الفاظ ہی میں یہ ہے کہ ”سنت درحقیقت ایک تعالیٰ اصطلاح ہے جسکی تشکیل ”آزاد شخصی رائے“ سے ہوتی ہے۔ اور ”عوام الناس“ یا ”رائے عامہ“ کے قبول کر لینے کے بعد وہی چیز ”سنت“ بن جاتی ہے اور رائے عامہ کے اس قبول کر لینے کا نام ہی ”اجماع“ ہے جسکو وہ ”آزاد اجماع“ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ان کی تحقیق کے مطابق ملت مجموعی طور پر سنت نبویؐ کے مشمولات کی تخلیق کرنے کی مستحق ہے، ملت الفاظ پر زور نہیں دیتی بلکہ اسکی روح کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔ اور اس ”تعالیٰ اصطلاح کو جاری رکھنے کے لئے ڈاکٹر صاحب موصوف اس کا نام سنت جاریہ (زندہ سنت) رکھتے ہیں اور حضورؐ کی اصلی سنت کو سنت غیر جاریہ (مردہ سنت - معاذ اللہ) قرار دیتے ہیں۔ جسکی تشریح مختصراً یہ ہے کہ کتاب و سنت اور تعلیمات شریعت میں اتنی ”توسیع“ کر دی جائے کہ جدید تہذیب و تمدن کے پیدا کردہ تمام مسائل اور خرابیاں عامۃ الناس کی رائے اور تعالیٰ کی وجہ سے حسبِ خواہش سنت اور شریعت میں سمائے جاسکیں۔

تحریف و تبیس اور دین کی بنیادوں میں رختہ اندازی کے لحاظ سے چودھویں صدی کی یہ تحقیق شکرینِ حدیث کے پہلے گروہ سے زیادہ ہلکا اور خطرناک ہے، تعجب ہے کہ بعض سادہ لوح حضرات کی نظریں لاعلمی یا دینی بے حیاتی کی وجہ سے فضل الرحمن کی اس تکنیک پر نہیں جاتیں اور وہ ”انکار حدیث“ کے دوسری جماعت کی بیادست کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ فضل الرحمن یا اس کے ادارہ کی طرف سے اگر ”پر دینی نظریہ“ کے تعاقب میں کوئی مضمون آتا ہے تو وہ صرف اس وجہ سے کہ انہیں ”پر دینی انداز فکر“ مسلمانوں کے دینی احساسات اور جذبات کی وجہ سے اسلام کے حق میں کم خطرناک معلوم ہوتا ہے۔ جبکہ یہ لوگ قصر اسلام کو خاکم بدہن جلد از جلد پیوند خاک دیکھنا چاہتے ہیں (ولا فخر للذکذک) یہ لوگ اپنے مقصد کے لئے چور اور منافق بن کر وہ پردہ جریلوں سے اس قصر میں نقب زنی کو زیادہ مؤثر اور مفید سمجھتے ہیں۔ پر دین جیسا جارحانہ اور دو ٹوک طریقہ نہیں۔ اگر ”پر دینی جماعت“ کھلے ارتداد اور کفر صریح کا راستہ چھوڑ کر ان کی

۱۔ مذکورہ بالا نظریہ کی تفصیلات کے لئے ملاحظہ فرمائیے ماہنامہ فکر و نظر جولائی، اگست ۱۹۶۳ء

مقالہ ”تعدیل سنت اور دیگر مضامین“

طرح نفاق اور تبلیغ کا راستہ اختیار کرے تو آج ہی یہ دونوں مکتب فکر گلے مل سکتے ہیں۔ پھر ان دونوں مکتب فکر میں میدان الحاد و تجدد کی سیادت و قیادت کا جذبہ بھی کارفرما ہے جو انہیں ایک دوسرے کا رقیب اور حریف بنانے پر مجبور کرتا رہتا ہے۔ ورنہ فرق باطلہ کے نفسیاتی مطالعہ اور ارشادات نبوی کی روشنی میں اصل اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں سب ایک ہیں۔ طریق کار، انداز بیان اور تعبیرات میں فرق ہے۔

چودھویں صدی کے اباحت زدہ لوگوں کو اسلامی اقدار سے فرار کے لئے مستشرقین یورپ، ہمارے ہاں کے اہل تجدد اور اسلام کے تعمیر نو (NEW CONSTRUCTION) کا نعرہ لگانے والوں اور اس کو حالات اور ظروف کا تابع بنانے والوں کی یہ تحقیق خوب بھاتی ہے کہ ہوس زدہ عوام کی اکثریت اور دین سے عموماً بے خبر عامۃ الناس کی خواہشات اور فیصلوں کو دین میں سنت جاریہ، آزاد اجماع، شخصی اجتہاد وغیرہ کے نام سے حجت اور اتھارٹی کا مقام دے دو۔ پھر دیکھو کہ جو فواحش اور منکرات دین میں قطعی حرام تھے، کس طرح وہ یکایک عامۃ الناس کے اپنانے سے جائز اور حلال بلکہ قانون اور شریعت کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ اگر اس آزاد اجماع اور ”شخصی رائے“ کو احکام شرعیہ کا ماخذ اور ”سنت جاریہ“ مان لیا جائے تو پھر کون ہے جو سینہ بے پردگی، فحاشی، سود بنگلہ بڑا الغرض یورپ کے تمام اخلاقی معاشرتی اور اقتصادی مسائل کو اسلام سے مخالف کہہ سکے۔ کل اگر آزاد شخصی رائے سے تشکیل پاتی ہوئی ”سنت جاریہ“ سوشلزم کو پسند کرے، پریسوں کیونزم یا کمیٹیٹل ازم کو اور کچھ عرصہ بعد وصال اور اسکی لائی ہوئی یورپی تہذیب کو گلے دگائے تو ان میں سے ہر چیز کو سنت نبویؐ کا مقام حاصل ہو جائے گا۔ والعیاذ باللہ ذرا اور گہرائی میں جائیے تو نتیجہ کے لحاظ سے ”سنت اور حدیث“ سے تلاعب اور تمسخر کرنے والی دونوں جماعتیں اس نکتہ پر اکٹھی ہو جاتی ہیں کہ ”اطاعت رسول“ اور شریعت کی بجائے ہر دور کے عوام کے فیصلوں کو وہی حیثیت دیدو جو رسول اور اسکی سنت کو حاصل ہے۔ البتہ پرویزی مکتب فکر میں اسکی تعبیر ”مرکز ملت“ کے نام سے کی جاتی ہے اور متحد دین کے ہاں ”زندہ اور مردہ سنت“ سے اور کبھی آزاد اجماع اور ”اجتہاد“ کی آڑ میں عوام یا ان کی منتخب کردہ پارلیمنٹ (مقننہ) اگر اسے اسلامی نقطہ نظر سے مقننہ کہنا جائز بھی ہو) کو ہر قسم کے فیصلوں کا حق دیا جاتا ہے۔ خواہ ان فیصلوں کا مقصد کتاب و سنت اور اس کے منصوص احکام کو ”ویٹو“ کرنا ہی کیوں

نہ ہو۔ اور اس خود ساختہ اجماع سے امت کے پیچھے تمام اجماعی مسائل کا توڑ کیوں نہ ہو رہا ہو۔

پھر اس غلط اور خطرناک تصورِ اجماع کا پروپیگنڈا اس زور شور سے کیا گیا ہے کہ بد قسمتی سے اور تو اور ہمارے قابلِ انتظام صدرِ مملکت تک اس نظریہ سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اپنی کتاب ”فریڈنٹ ناسٹ ماسٹر کے گیارہویں باب ”آئین اور نظریہ حیات“ میں انہوں نے اجماع کے اسی مفہوم کو اپنا لائحہ عمل بنانا چاہا ہے۔ اور چونکہ ملی آئین اور ضابطہ حیات کی تشکیل میں صدرِ محترم کو اہم ترین مقام حاصل ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ انہی خطوط پر وہ ملک کی قانون سازی کو پسندیدہ سمجھتے تھے جس کے اثرات سے مستقبل میں پورے ملک کے مسلمان اکثریت کا متاثر ہونا لازمی تھا۔ اجماع کا وہ تصور جو اسلام نے کتاب و سنت کی روشنی میں ہمیں دیا ظاہر ہے کہ اس کے لئے جو اہلیت اور صلاحیت ملحوظ رکھی گئی تھی، عوام تو کیا اس دور کے خواص امت تک میں اس کا پایا جانا مشکل ہے۔ صدرِ محترم کے خیال میں ایسے اجماع سے جمہوری قدروں کی پائمالی ہوتی ہے۔ اس لئے وہ قانون و شریعت پر علماء یا دینی علوم سے وابستہ کسی خاص گروہ کی اجارہ داری ناجائز سمجھتے ہیں اور زمانہ جدید میں اجماع کا مصداق قانون ساز اداروں کی رائے ہی کو قرار دیتے ہیں۔

حالانکہ ظاہر ہے کہ اسلام میں علماء اور ملا ”کسی خاص رنگ و نسل یا کسی مخصوص پیشہ یا کسی خاص قوم و نسب سے نسبت رکھنے والی جماعت کا نام نہیں، نہ اسلام میں اس پابائیت اور برہمنیت کی گنجائش ہے۔ بلکہ مسلمانوں کے ہر طبقہ میں سے جو بھی چاہے بلا امتیاز رنگ و نسل اور بلا تفریق قوم و پیشہ، کتاب و سنت اور اسلامی علوم کا صحیح علم و فہم حاصل کر کے عالم بن کر منصبِ دراشتِ نبوت پر فائز ہو سکتا ہے۔ رنگ و نسل کا امتیاز تو کیا دین کی ترجمانی کا یہ منصب جلیل مسلمانوں کی عورتوں اور غلاموں تک کو نصیب ہو سکتا ہے۔ تو پھر اصل معاملہ ”ملا“ کی اجارہ داری کا کب رہ جاتا ہے؟ اس صورت میں اگر ہم ”ملا“ کا نام لے لیکر دین کی اجارہ داری اور تعبیر و ترجمانی میں اپنے آپ کو شریک کرنا چاہیں تو درحقیقت ہم تشریع اور قانون سازی کے لئے کتاب و سنت کی بالادستی اور اجارہ داری کے روادار نہیں ہوں گے۔ بیشک اسلام نے جمہور امت اور مسلمانوں کے عمومی پسند اور انتخاب کی اہمیت تسلیم کی ہے۔ یہاں تک کہ اسے اجماع، استخسان، عرف، اور تعامل امت کے نام سے اسلامی قانون کا ایک اہم رکن قرار دیا گیا ہے۔ مگر اس کے ساتھ اس

نے یہ بھی لازم کر دیا ہے کہ جمہور کا کوئی فیصلہ نہ تو کتاب و سنت اور خدا و رسول کی مرضی اور دین کے عمومی مزاج سے متصادم ہو اور نہ کسی چیز کو اپنانے میں خواہش پرستی، نفس پروری اور دین سے گریز کا داعیہ شامل ہو۔ جمہوریت کے نام سے دین اور شریعت میں عوام کو اس طرح کی آزاد قانون سازی کا حق دینا بالکل ایسا ہی ہے کہ ہم ملک کی تعمیری اور ترقیاتی منصوبوں میں کسی انجینئر کی رائے اور قابلیت سے استفادہ کی بجائے عام لوگوں کو جنہیں انجینئرنگ کی معمولی شہدہ بھی نہ ہو سارا کام سپرد کر دیں، کسی قابلیت اور صلاحیت کے بغیر عوام کو تربیلہ اور منگلا جیسے بھاری بھر کم منصوبوں کی تعمیر و تشکیل کا کام سپرد کر دینا جمہوریت پروری نہیں بلکہ جمہور اور جمہوری اقدار سے دشمنی ہوگی۔ اسی طرح ڈاکٹری اور میڈیکل کو یجئے، لوگوں کی صحت، بیماری اور خصوصاً اجسام انسانی کی چیر پھاڑ جیسا نازک کام عوام کے سپرد نہیں کیا جاسکتا۔ کیا ملک کے ہر شخص کو جان بلب مریضوں کے اپریشن کا حق اس لئے دیا جاسکتا ہے کہ اسے منع کرنا جمہوریت کی پائمالی ہوگی؟ نہیں؛ بلکہ میڈیکل کا نازک ترین کام وہی شخص انجام دے سکے گا جسے مطلوبہ قابلیت، تعلیم، ڈگری اور تجربہ پر سے طور پر حاصل ہو۔ اور کیا ملک کے ہر شہری کو خواہ وہ مروجہ عدالتی قوانین اور عدالتی نظام سے معمولی آگاہی بھی نہ رکھتا ہو یہ حق دیا جاسکے گا کہ وہ چیف جسٹس یا پورے عدلیہ کے فیصلوں کو چیلنج دے سکے، یا قتل جیسے مقدموں کا فیصلہ کرتا پھرے، یا اسے وکالت کا اختیار دیا جائے۔ پس ظاہر ہے کہ جب دنیادی علوم میں اس قسم کی اجارہ داری کو ہم جمہور کی حق تلفی قرار نہیں دے سکتے تو دین، شریعت، اور زندگی پر لاگو ہونے والے قوانین کے لئے مخصوص شرائط قیودات اور خاص قسم کی قابلیت اور اہلیت کے التزام کو کیوں جمہوری اقدار کی خلاف ورزی سمجھا جائے؟

پس بلاشبہ شریعت نے ہر کس و نا کس کو نہ تو اجتہاد کا حق دیا ہے نہ شخصی رائے پر اٹھانے لگے آزاد اجماع کو وہ دین کا اصل قرار دیتا ہے۔ بلکہ اجماع ایسے لوگوں کا ہی معتبر ہوگا جو خدا ترسی، تقویٰ، خشیت، فراست، ایمانی، بصیرت دینی، جذبہ خیر خواہی و حق کوئی جیسی صفات سے مالا مال ہوں، علمی اور فنی لحاظ سے ہر طرح کا مل کامل جامع اور عمیقی شخصیتیں ہوں۔ ان کا کوئی فیصلہ تعصب، تحریب، عناد، جہل، خود غرضی اور خواہشات نفسانی پر مبنی نہ ہو اور پھر ان کے فیصلوں کے لئے اللہ، رسول اور عہد صحابہ و تابعین سے کوئی قوی ”سند“ بھی موجود ہو۔ ایسے ہی لوگ اجتہاد و استنباط کے اہل ہوں گے اور ایسے ہی تمام بزرگوں کا اتفاق ”اجماع“

قرار پائے گا۔ ممکن تھا کہ آج بھی ان شرائط اور قابلیتوں کے ساتھ اجتہاد کا دروازہ کھولا جاسکتا مگر افسوس! کہ واقعاتی دنیا میں صدیاں ہوئیں وہ کبھی کم ہو چکی ہے جسے لیکر ابوحنیفہؒ اور شافعیؒ احمد بن حنبلؒ اور مالک رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے اساطین علم و فضل یہ دروازہ کھولا کرتے تھے۔
 — اب انہیں ڈھونڈ پراغ رخ زیبا لیکر۔

بہر تقدیر اسلام کی نظر میں اصل اطاعت اللہ اس کے رسول اور اصل مقام کتاب و سنت اور اس سے مستنبط احکام۔ بول کا ہے۔ اگر امت کی اکثریت یا مسلمانوں کی منتخب کردہ کوئی پارلیمنٹ کسی غیر شرعی فیصلہ یا کسی گمراہی پر متفق ہو بھی جائے تب بھی امت میں ایک مضبوط جماعت ہمیشہ ایسی پائی جائے گی جو اس ”اجماع صلاحت“ کی نہ صرف مخالفت بلکہ حق کی اعلان و اشاعت کرتی رہے گی۔ مجموعی امت گمراہی پر حسب بشارت نبویؐ (لا یجتمع امتی علی الضلالة) ہرگز متفق نہیں ہو سکتی، بنا بریں نہ تو مرکز ملت یا قوت ہماکہ کو اطاعت رسول سمجھا جاسکتا ہے۔ اور نہ ہم یورپ کے اسلام دشمن یہود و نصاریٰ سے درآمد شدہ نظریات کو سنت جاریہ کہہ سکتے ہیں اور نہ زنا بالرضا جیسے صریح فاحشہ کو قانونی حیثیت دینے پر اتفاق کرنے والی پارلیمنٹ کے فیصلوں کو ”اجماع“ قرار دیا جاسکتا ہے۔ بلکہ جس طرح دیگر دینی اصطلاحات، صلوٰۃ، صوم، حج، زکوٰۃ، قربانی وغیرہ کا ایک خاص شرعی مفہوم ہے۔ جسے نہ تبدیل جاسکتا ہے۔ نہ ان میں ”ترسیع“ اور ترمیم ہو سکتی ہے۔ ”جس طرح“ کتاب سے مراد وہی قرآن کریم ہوگا جسے امت اب تک متواتر آسمانی صحیفہ مانتی چلی آرہی ہے۔ اسی طرح سنت، اجماع اور اجتہاد کے وہی معانی قابل قبول ہوں گے جو عہد صحابہؓ سے لیکر اب تک متواتر چلے آرہے ہیں اور جس طرح کتاب، وحی، نبوت، رسالت وغیرہ الفاظ کے شرعی مفہومات قطعی اور اس میں تحریف و تبدیل اور غلطی بروزی کی تفریق الحاد، کفر اور زندقہ ہے، اسی طرح اسلام کے اصول اربعہ، کتاب و سنت و اجماع و اجتہاد کو اپنے اصلی معانی سے الگ کرنا اور اسے اپنے من مانی معانی پہنانا تحریف فی الدین اور دین تلاعب اور مذاق ہی سمجھا جائے گا، جسے امت کا عمومی دینی مزاج قیامت تک برداشت نہیں کرے گا۔ واللہ یقول الحق وھو یدھی السبیل۔

کعبہ الہی
 جمادی الاولیٰ